ایک عظیم بزرگ کی چند خوبیاں
مولوی محمد شفیع بجنوری

مولانا عبدالماجد دریابادی

اخباری شہرت کے آدمی نہ تھے لیکن مرجع خلائق ضرور تھے وطن شہر لکھنؤ سے متصل قصبہ بجنور تھا لیکن فیض کا حلقہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔لکھنؤ، اناؤ ،کان پور، بارہ بنکی فیض آباد، جون پور، الہ آباد، رائے بریلی، سیتاپور اوران شہروں کے قصبات اور دیہات کا ذکر نہیں دور دراز مقامات بھوپال سہارن پور، جھانسی، ناگپور، جبل پور، بمبئی، پونا، ڈھاکہ، چاٹگام تک سے لوگ کھینچے ہوئے چلے آتے ہیں اور حضرت خود جہاں کہیں پہنچ جاتے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے، خلقت معلوم ہوتا تھا کہ ٹوٹی پڑتی ہے۔

۸/ذی الحجہ ۱۱/ستمبر ۱۹۵۱ء کو عین موسم حج میں عین سرزمین مکہ پر انہیں بافیض و بے مثال بزرگ نے جنہیں دنیا مولوی محمد شفیع بجنوری کے نام سے یاد کرتی تھی داعی اجل کو لبیک کہا۔

یہ تاریخ اور یہ زمین اگر نہ ملتی تو حیرت ہوتی اس سرزمین کے بار بار چکّر اتنے بار لگا چکے تھے کہ حجاز گویا وطن ہی بن چکا تھا۔حج وزیارت کی سعادت کم از کم ۲۵ بار تو ضرور ہی حاصل ہو چکی تھی۔عجب نہیں کہ اس سے زائد ہی مرتبہ ہو، عمر اکیاسی سال سے اوپر تقریباً ۸۵/سال کی تھی، لیکن ہڈی چوڑی، سینہ کشادہ، جسم ایسا بھرا بھرا کہ اصل سن سے ۱۵، ۲۰ سال سے کم ہی معلوم ہوتے تھے۔

پرانے دیکھنے والوں اور بوڑھے رفیقوں کا بیان ہے کہ جذب و استغراق کی کیفیتیں پیدائشی تھیں۔کشف تکوینی اس غضب کا تھا کہ مستقبل کے واقعات کثرت سے اور بے اختیار زبان پر آجاتے تھے۔عجب عجب قصے لوگوں کی زبان پر اس دور نوعمری کے تھے، بعض تو بالکل ناقابل یقین حد تک حیرت انگیز اذکار واشغال ریاضتیں مجاہدے سے کرامتیں ایک سے بڑھ کر ایک عجیب اسی زمانہ سے متعلق منقول ہیں۔

صوفیہ ومشائخ کے درمیان ایک شغل، ''شغل اسدی'' کے نام سے موسوم ہے۔اس میں کہا جاتا ہے کہ سالک کے جسم کا ایک ایک عضو اس سے الگ ہو جاتا ہے ابھی چند سال ہوئے ایک ثقہ صاحب علم نے ایک واسطے سے (شاید دو واسطے ہوں) یہ روایت بیان کی ہے کہ راوی اول نے محض اتفاق سے ایک بار حاجی صاحب کو عین اسی حالت میں دیکھ لیا تھا۔ضرور نہیں کہ اس قسم کی روایتیں صحیح بھی ہوں تاہم کسی ذات سے متعلق ان کی کثرت اشاعت بالکل بے معنی بھی تو نہیں کہی جا سکتی۔

تعلیم باطن وتربیت سلوک کے لئے مرشد بھی ایسا ہاتھ آ گیا جو اپنے وقت میں امام فن تھا۔قصبہ گنج مرادآباد (ضلع اناؤ) میں محدث مولانا فضل رحمان نقشبندی ایک بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔اتباع سنت کے پیکر بے مثال، بیعت انہیں سے کی۔محض بیعت اعتقادی نہیں، بیعت عشقی بھی۔جوہر خود اتنا قابل اور پھر مربی ایسا کامل زیارت کعبۃ اللہ کا شوق موجزن تھا ہی، ایک دن کیفیات سے لبریز جوان مرید نے مرشد سے بے تابانہ عرض کیا کہ حضرت اجازت دیں کہ اب کی قصد حج وزیارت حرم رکھتا ہوں۔ارشاد ہوا زادِراہ کا بھی سامان ہے جواب میں مستانہ بیخودی کے ساتھ یہ شعر زبان سے نکلا۔

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہ ہاست بسے
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

مولانا باوجود اس کے کہ عارف کامل اور صاحب مقام تھے، مغلوب الحال عاشق صادق کے جذبات سے چند سکنڈ کے لئے خود بیخود ہو گئے، اور بے اختیار چیخ زبان سے نکل گئی لیکن معاً سنبھلے اور ارشاد فرمایا کہ کیا واہیات ہے میں مسئلہ شرعی دریافت کر رہا ہوں اور تم جواب میں شاعری کر رہے ہو۔''

بات ہوگئی درمیانی مرحلے چھوڑیئے۔عین حج کے موسم میں جب خانہ کعبہ کا دروازہ کھلا ہوتا ہے اور ہر حاجی وزائر قدرتاً شوق دید کا رکھتا ہے، شیبی کلید بردار کی نظر پڑی کہ ایک حاجی بار بار بیتابانہ طواف تو کر رہا ہے مگر معلوم ہو رہا ہے کہ داخلے کا نہایت درجہ آرزومند ہے لیکن اس کا قصد نہیں کرتا ہے۔داخلہ کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بلا کسی قید کے اور بلا کسی نذرانہ کے ہونا چاہئے لیکن کلید بردار خاندان نے صدیوں سے یہ دستور بنا رکھا ہے کہ بلا نذرانہ وصول کئے ہوئے کسی کو اندر جانے نہیں دیتے۔فقہانے اسے رشوت کے حکم میں رکھا ہے اور اسے ناجائز بتایا ہے۔عاشق وعالم میں اب کش مکش ہو رہی ہے۔یہ عاشق صادق صاحب علم بھی تھا اور مست ہونے کے ساتھ بیدار بھی، کچھ دیر کے بعد عشق علم پر غالب آ گیا اور یہ نوجوان نذرانہ کا روپیہ بہ کراہت دربان کی طرف

پھینکتا ہوا اندر داخل ہو گیا لیکن ادھر اس کا جانا تھا کہ ادھر وہ صاحب اختلاج قلب میں مبتلا ہو گئے اور بے اختیار یہ چاہنے لگے کہ وہ مردِ خدا ابھی واپس ہو تو ابھی بہ جبری نذر اس کی خدمت میں معذرت کے ساتھ واپس کر دی جائے۔ خدا خدا کر کے وہ وقت آیا اور جب وہ نوجوان باہر نکلنے لگے تو شیعی صاحب نے خود معتقد ہو کر وہ نذر اسے واپس کی اور معاً ان کی طبیعت بحال ہو گئی بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ سوختہ قلب ہمارے ہی حاجی محمد شفیع بجنوری تھے۔

مولانا تھانویؒ جن کے کمالات روحانی و عرفانی کا آفتاب بعد میں چمکا اس وقت محض ایک نوعمر مولوی ہی تھے اور کان پور کے مدرسہ جامع العلوم کے صدر اور شہرت صرف ایک اچھے مدرس کی حیثیت سے رکھتے تھے۔ حضرت گنج مراد آبادی کی خدمت میں اکتساب فیض کے لئے حاضر ہوئے واپسی کے وقت حضرت نے اپنے اسی عزیز مرید کو ان کے سپرد فرمایا اور کچھ تخصیصی الفاظ اس طرح کے فرمائے کہ ہمارے اس لڑکے کو پوری طرح پڑھا دینا (او کما قال) مولانا یوں ہی اپنے ہر طالب کے حق میں سراپا شفقت و توجہ تھے، چہ جائیکہ اتنے زبردست وسیلہ سفارش کے بعد۔ حاجی صاحب نے علوم شرعی ظاہری کی تحصیل و تکمیل کئی سال تک اسی مدرسہ میں رہ کر کی۔ اسی استاد کامل کی رہبری و نگرانی میں اور پورے عالم بن کر نکلے۔ تحصیل معاش کے بعد فن طب کی تعلیم بھی حاصل کر لی۔ غالباً اس زمانہ میں میرٹھ کے نامور طبیب حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری مرحوم بھی حاجی صاحب کے ہم درس اسی مدرسہ میں تھے۔

حاجی صاحب کے قصے کشف و کرامات کے اس دور کے عام ہیں۔ ایک ثقہ راوی نے اپنا مشاہدہ مجھ سے ۱۵، ۲۰ سال ہوئے بیان کیا تھا کہ ایک رات کو مطالعہ کے وقت حاجی صاحب کے حجرے میں آگ لگ گئی۔ شعلے بلند ہونے لگے بلکہ کپڑوں تک میں آگ پہنچ گئی لیکن حاجی صاحب نہ صرف محفوظ رہے بلکہ اسی طرح مطالعہ میں مشغول! اب عجائب و خوارق کی توجیہہ و تاویل جو بھی کی جا سکے بہر حال جس طرح انہیں آنکھ بند کر کے قبول کر لینا آسان نہیں، اسی طرح ان کی یکسر تکذیب و تردید بھی ثقہ و معتبر گواہوں کے ہوتے ہوئے ذرا مشکل ہی ہے اور خیر یہ عقیدہ تو سب جاننے والوں میں اس وقت عام ہو گیا تھا کہ حاجی صاحب مستجاب الدعوات ہیں ان کی زبان سے جو کچھ نکل جاتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے۔ ایک واقعہ اس سلسلہ میں بڑا اہم اور نتیجہ خیز ہے سنئے خود حضرت تھانویؒ کا بیان کیا ہوا:

''مدرسہ میں تعطیل تھی باہر سے ایک رفیق درس کا خط حاجی صاحب کے نام آیا۔ پتہ پر انتہائی تعظیمی القاب ''قطب وقت'' وغیرہ درج تھے، مدرسہ کی ڈاک صدر مدرس کی حیثیت سے مولانا تھانویؒ کے پاس آتی تھی۔ حضرت نے حاجی صاحب کو بلا کر طنز سے ارشاد فرمایا کہ لیجئے اب تو آپ قطب وقت ہو گئے۔ اور وہ خط ہاتھ میں دیا۔ حاجی صاحب جھنجھلا کر بولے، ایسے لوگوں کا دماغ بھی خراب نہیں ہو جاتا تا خواہ مخواہ مجھ کو رسوا کرتے ہیں۔ دو ہی چار روز گزرے تھے کہ اس طالب علم کے بھائی کا خط آیا کہ فلاں تاریخ فلاں وقت وہ طالب علم دفعتاً مجنوں ہو گیا خدا کے لئے دعا فرمائیں۔ اب حاجی صاحب بڑے قلق و اضطراب میں مبتلا ہو گئے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر آنسوؤں کے ساتھ بڑے الحاح و اضطراب کے عالم میں بولے کہ حضرت آخر کیا کروں، وہ فقرے میں نے کچھ دشمنی میں اور جان کر تھوڑے ہی کہے تھے۔ بس جھنجھلاہٹ میں زبان سے نکل گئے تھے۔ میں تو اس نعمت سے عاجز آ گیا ہوں۔''

دشواریاں عوام ہی کو نہیں خواص و اکابر کو بھی پیش آتی رہتی ہیں، اور ایسے ورطہ سے نکالنا کام حضرت حکیم الامت ہی جیسے وقیقہ سنج مصلحین و حکماء کا ہو سکتا ہے کسی محض بزرگ کا نہیں۔ حضرتؒ نے فرمایا: ''اس کا علاج بھی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے اسی حربہ سے کام لیجئے جو آپ کے پاس موجود ہے، دعا کیجئے کہ اللہ اس نعمت عظیم کے بار کا تحمل اب مجھ ناتواں سے نہیں ہوتا اسے بدل کر کسی دوسری نعمت سے سرفراز فرمایا جائے۔ دعا آپ اپنی زبان سے کیجئے جس کی مقبولیت کے یہ سب کرشمے ہیں۔ آمین میں بھی کہتا جاؤں گا۔''

حاجی صاحب اس تشخیص اور معالجہ کو سن کر باغ باغ ہو گئے۔ عمل اسی وقت کیا اور یہ دعا بھی فی الفور قبول ہو گئی یعنی اسی وقت سے وہ خاص کیفیت سلب ہو گئی۔

مولانا گنج مراد آبادی کا سال وفات غالباً ۱۳۱۳ھ یا ۱۸۹۵ء تھا اس کے بعد ہی حاجی صاحب اپنے مراتب کمال کی تکمیل مزید کے لئے ایک دوسرے شیخ وقت اور مرشد گر بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان حاجی صاحب کے مرتبہ کا کیا کہنا۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حکیم الامت تھانویؒ، مولانا محمد حسین الہ آبادیؒ، مولانا احمد حسن کان پوریؒ (شارح و مشہور ناشر مثنوی) وغیر ہم کتنے اس شمع کے پروانے تھے جو آگے چل کر خود آفتاب و ماہتاب ثابت ہوئے۔ حاجی صاحب بھی اس نظر کیمیا اثر سے مستفید ہوتے اور اب قیام حرمین کا شوق بھی دل کھول کر پورا کرتے۔ ارض پاک کی حاضری کے ساتھ ساتھ مرشد کی بزم میں بھی حضوری............ اب کون بتائے، کونے جانے کہ یہاں کیا کیا، کیا کیا پایا۔

بے ہوشوں میں اتنا ہوشیار، دیوانوں میں اتنا فرزانہ مستوں میں اتنا بیدار کمتر ہی کوئی گزرا ہوگا۔ایک طرف جوش و مستی سے لبریز دوسری طرف اتباع شریعت کا غایت اہتمام اور بیت اللہ کے تو گویا عاشق زار تھے۔ نام لیتے آنسو چلنے لگتے تھے وجہ معاش بظاہر کوئی خاص اور کوئی معقول نہ تھی اس پر بھی بار بار حج اور اس میں فراخدلی سے خرچ جسے ایک مستقل کرامت ہی سمجھنا چاہئے۔ خود ہی نہیں جاتے تھے دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے، بہتوں کی راستہ میں خبر گیری کرتے جاتے تھے۔ حج کا موسم آتا جوش و دیوانگی دیکھنے کے قابل ہوتا۔اور عین چلتے وقت، ریل پر بیٹھتے وقت تو معلوم ہوتا تھا کہ بس یہیں دم توڑ دیں گے، وہ جوش گریہ وہ مستانہ اور پرخروش موعظ اور تقریر وہ آنکھوں سے تڑپتی ہوئی بجلیاں، جس نے اس پُر اثر منظر کو دیکھا نہیں اس کی سمجھ میں آنا اور یقین کرنا ہی دشوار ہے۔ ہر دفعہ روانگی کے وقت لوگ یہی پیشین گوئی کرتے تھے کہ اب واپسی نہ ہوگی وہاں کی مٹی وہیں لئے جارہی ہے اور آخر کار زبان خلق کی اس منادی کا ظہور اللہ نے عملی شکل میں کر ہی دکھایا۔

نماز اور روزہ اور جملہ اصنافِ عبادت کے ذوق و شوق شغف و اہتمام کا کیا حال بیان ہو۔ دیکھنے سے اس کا تعلق تھا، تلاوتِ قرآن مجید کے علاوہ دوسرے اوراد و اذکار، خدا معلوم کب اور کن کن وقتوں میں کرڈالتے تھے۔ ضعیفی میں شوق حفظ قرآن کا ہوا اور عمل بھی اس پر کر گزرے۔ بظاہر اس سن میں حافظہ وہ کہاں سے آسکتا تھا۔ یاد کرنے اور روزانہ مزاولت نہ رکھتے تو پھر ذہن سے وہ جز نکل جاتا، خط میں حکیم الامت کو لکھا کر اپنی والی کوشش تو کی ہے اب دعا یہ فرمائیے کہ یاد بھی رہ جائے جواب آیا۔

''جس نے اس عمر میں اپنا کلام یاد کرنے کی ہمت دی اس کے یاد کرنے کی بھی توفیق دے دے گا۔''

سفر کے بڑے عادی تھے عمر کے آخری دو چار برسوں کو چھوڑ کر جب سن ضعف اور امراض کا اثر جسم پر نمایاں ہونے لگا تھا۔ معمول ہمیشہ سیّاحی ہی میں رہنے کا تھا آج یہاں کل وہاں۔ ابھی اس شہر میں ابھی اس شہر میں۔ اور کبھی ایک ہی شہر کے اس محلّہ سے اس محلے میں اور مالک مکان یا میزبان کو خبر تک نہیں ذی مروت اتنے کہ کسی بات کو رد کرنا جانتے ہی نہ تھے، اہل حاجت اپنی غرض کے آگے اندھے باؤلے۔ مسلسل نقل و حرکت ہی میں رکھتے۔ ابھی اپنے ہاں کہہ کر کے گئے کہ دو گھنٹے میں واپس لے آئیں گے اور ابھی اپنا ہی مستقل مہمان بنالیا۔ نہ کھانے کا ٹھیک نہ سونے کا، جس نے جب اور جہاں پایا بس اپنے کام کے لئے گرفتار کرلیا، مزاج میں مسکنت اور فروتنی اتنی کہ جہاں جگہ ملی وہیں پڑ لئے۔ مسہری اور پلنگڑی کے بجائے کھرّا تخت یا کھردری زمین کا فرش ہی کافی۔ کھانے میں موٹا چھوٹا کسی غریب آدمی نے جو کچھ بھی پیش کردیا۔ بس اسی کو پوری رغبت اور شوق سے تناول فرمالیا۔ معمولات شبانہ میں اس کثرتِ سفر کے باوجود نہ فرق آنے پاتا۔ بہت رات گئے تھک کر اور چُور ہو کر لیٹے ہیں مگر پھر دیکھئے تو اپنے وقت پر اٹھے بیٹھے ہیں اور یا نماز پڑھ رہے ہیں یا دعاؤں میں مصروف ہیں یا اپنے اوراد پورے کررہے ہیں۔ عملیات سے بھی ذوق رکھتے تھے بلکہ اس فن کے بھی ماہر تھے اور عوام اس صفت کے معتقد ہو کر ان پر پروانہ وار گرتے تھے۔ محض عوام ہی نہیں اچھے خاصے خواص بھی، اور ہر وقت تعویذ، نقش، گنڈے، فلیتہ کے لئے گھیرے رہتے تھے۔ حاجی صاحب کسی کو بھی محروم و ناکام واپس نہ کرتے، سب کی تعمیل فرمائش اپنا فرض جانتے موم بتیاں جلا کر تعویذ نقش وغیرہ لکھا کرتے کیا ٹھکانا ہے خدمت خلق کے اس شغف و انہماک کا اصل کمال تو ان بزرگ کا ان کی عبدیت و شکستگی ہمہ وقت تضرع و ابتہال تھا، لیکن ان کمالات پر نظر تو خال خال کسی کی جاتی۔ ۹۵ فیصد مخلوق محض ان کے ''عامل'' ہونے کی حیثیت سے ان کی گرویدہ رہتی اور سفر و حضر میں صحت و بیماری میں رات ہو کہ دن کسی حال میں ان کا پیچھا نہ چھوڑتی۔ تسخیر جنات کے قصے بھی اس سلسلے میں عجیب عجیب مشہور ہیں۔

باوجود کمال شورش و شوریدگی ضبط اور اپنے اوپر قابو بھی درجۂ کمال ہی میں رکھتے تھے اور احترام شریعت میں تو وہ حوصلہ و اہتمام تھا کہ باید و شاید ان کی زندگی آزاد اور بے قید درویشوں کے لئے ایک مکمل درس ہدایت تھی۔ عارف رومی نے تو ایک جگہ آداب و داناؤں اور سوختہ جانوں کے دو گروہ الگ کر کے دکھائے ہیں اور صحیح دکھاتے ہیں۔

موسیا آداب دانان دیگراند

سوختہ جان وروان دیگراند

لیکن یہاں آداب دانی اور سوختہ جانی دونوں ایک ہی ذات میں متحد ہوگئی تھیں۔ شریعت کے ساتھ ادنی استخفاف کو نہیں برداشت کرسکتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں فتنہ نگار کے سلسلہ میں لکھنؤ کے امین الدولہ پارک میں مسلمانوں کا ایک جلسہ عظیم نگار کی مسلم آزاد تحریروں پر احتجاج کے لئے منعقد ہوا تو میں نے ڈائس کے اوپر سے دیکھا کہ ایک پیر مرد قریب ہی بیٹھے ہوئے جوشیلے نعرے لگا رہے ہیں اور جوش سے بے خود ہوئے جارہے ہیں اس وقت تک حاجی صاحب کی خدمت میں نیاز حاصل نہ تھا۔ جلسہ کے بعد پوچھ تاچھ کی تو معلوم ہوا کہ بزرگ حاجی صاحب ہی تھے، حالانکہ مدیر نگار سے قرابت بھی حاجی صاحب کی قائم ہو چکی تھی۔

فیاض اور عالی حوصلہ بھی اس درجہ تھے۔ روپیہ خدا معلوم کہاں سے آتا تھا اپنے عام نیاز مندوں سے طالب امداد ہونا تو کجا الٹے خود انہیں کی مدد اور وہ بھی اچھی خاصی رقموں سے فرمایا کرتے تھے۔ سواس کو قرض دے رہے ہیں۔ ڈیڑھ سواس کو اور یہ قرض بھی نام ہی کا قرض ہوتا تھا دی ہوئی رقم واپس قبول ہی کب کرتے تھے؟ مخلصانہ نذر لوگوں کی قبولیت خاص خاص مخلصوں تک محدود تھی۔ بدعتی رسوم اور رواج پرستی والے رواجی تصوف سے منزلوں دور تھے البتہ خلق مروت ونرم دلی کے باعث اہل بدعت پر نکیر میں زیادہ سختی نہ کرتے۔

دن رات میں خدا معلوم کتنی بار روتے اور رلاتے رہتے، امت کی سابقہ عظمت کا ذکر آیا اور ان کے آنسو بہنے لگتے، ملت کی موجودہ پستی کا نام آیا اور ان پر گریہ بے اختیاری طاری ہوگیا، محض روتے ہی نہیں اسی حالت میں جوش وخروش کے ساتھ تقریر بھی کرتے اور اللہ سے دعائیں بھی مانگتے کہ حق کے تو گویا امام ہی تھے، میں نے یہ جامع اور پر اثر دعا انہیں کی زبان مبارک سے سنی اور سیکھی۔

اللھم اغفر ذنوبنا، واستر عیوبنا، واشرح صدورنا وحفظناقلوبنا ونور قلوبنا، یسرنا مورنا وحصل مرادنا وتمم تقصیرنا . اللھم نجنا مما نخاف یا حفی الالطاف.

اے اللہ ہمارے گناہ بخش دے اور ہمارے عیوب ڈھانپے رہ اور ہمارے سینوں کو کھول دے اور ہمارے دلوں کو روشنکر دے اور ہمارے معاملات کو آسان کردے اور ہماری مرادیں عطا کردے اور ہماری کوتاہیوں کو پورا کردے اے اللہ ہمیں ہر اس چیز سے نجات دے جس سے ہمیں ڈر معلوم ہوتا ہے اے لطف وکرم کی دھن میں لگے رہنے والے۔

فرض نماز کے بعد جب سلام پھیر کر اور دعاؤں کے ساتھ یہ دعا پڑھتے تو مجسم الحاح وتضرع بن جاتے، **اللھم نجنا مما نخاف**۔ اس فقرے کو دو دوتین تین بار اور بڑے جوش وخروش کے ساتھ ادا کرتے، داڑھی آنسوؤں سے تر ہوجاتی۔

ہمارے گھر بھر پر خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ عورتیں ان کی بے طرح معتقد تھیں۔ ذرا کوئی بیمار ہوا یا اور کسی قسم کی پریشانی لاحق ہوئی بس فوراً خط جاتا۔ آدمی حاجی صاحب کے پاس فوراً دوڑا گیا اور آپ ہر ممکن دعا وتدبیر میں لگ جاتے۔ حضرت تھانویؒ کی وفات کے بعد ہم لوگوں کا بڑا سہارا ایک انہیں کی ذات رہ گئی تھی۔ ایسے مقبولین کا سہارا اس آسانی سے ہاتھ کب آتا ہے؟ تقسیم ملک کے بعد جب سے لکھنؤ کے مشہور مدرسہ فرقانیہ پر زوال آنا شروع ہوگیا تھا حاجی صاحب اب اس کا بڑا آسرا رہ گئے تھے خود وہیں جاکر مستقل قیام اختیار کرلیا اور ہمت کرکے اس کی گرتی اور ڈوبتی ہوئی حالت کو سنبھال لیا۔

حرم پاک کی خاک تو اتنی مرتبہ چھانی تھی کہ گویا وہیں کے ہوگئے تھے، حجاز کا دور دراز کا پرسعادت سفر اس ضعیفی میں اور ظاہری عسرت کے باوجود ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی۔ ابھی معلوم ہوا کہ بمبئی گئے ہیں اور ابھی خبر سنائی دی کہ جہاز پر بیٹھ کر فلاں فلاں کو اپنے ساتھ لے کر مکہ روانہ ہوگئے اور جن لوگوں نے حاجی صاحب کو حرمین میں دیکھا ان کا بیان ہے کہ وہاں پہونچ کر حاجی صاحب بوڑھے معلوم ہی نہیں ہوتے تھے۔ سونو جوانوں کے ایک جوان ہوجاتے تھے نہ پیادہ چلنے سے تھکن نہ کھڑے رہنے سے۔ مدینہ منورہ میں مواجہ شریف کے سامنے کھڑے ہوئے سلام پڑھ رہے ہیں یا دعائیں کررہے ہیں تو بس اب کھڑے ہی ہوئے ہیں۔ جوان ساتھی تھک کر بیٹھ گئے ہیں لیکن ان کے ہاتھ دعا کے لئے اسی طرح اٹھے ہوئے ہیں، روتے جاتے ہیں اور رورو کر دردِ دل اس طرح سناتے جارہے ہیں حق تھا کہ یہ خاک کا پتلہ وہیں کی خاک کا جز بنے اور ایسے عالم میں دعوتِ اجل کو لبیک کہے کہ حشر تک مسلسل حج ہی میں گزرے وہی ہوا جو بندے نے چاہا، وہی اس کے مولا نے بھی چاہا۔

تو چُنیں خواہی خدا خواہد چُنیں

می دہد یزداں مراد متقیں

برائے نام بیماری کے بعد یہ اپنے رب کا عاشق اور متوالا اور اس کے رسولؐ کے نام کا دیوانہ ۸؍ ذی الحجہ کی سہ پہر کو احرام پہنے ہوئے اپنے مالک و مولا سے جاملا اور سال کی متبرک رات شب عرفات میں قبل عشاء مکہ معظّمہ کے مشہور گورستان ''جنت المعلّٰی'' میں صحابیوں اور اولیاء امت کے جوار میں راحت کی ابدی نیند سو گیا۔ وہی یوم عرفات جس کے لئے دنیا کے سب سے بڑے سچے کا ارشاد ہے کہ شیطان آج سے زیادہ مایوس کسی دن نہیں ہوا۔

قیام تک رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی رہیں اس کی تربت پر۔

☆......☆......☆